نقدِ اقبال کا متوازن زاویہ

ڈاکٹر شاہد نواز
اسسٹنٹ پروفیسر اردو، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا

CRITICISM ON IQBAL
A STUDY OF A BALANCED APPROACH

Shahid Nawaz, PhD
Assistant Professor of Urdu
Department of Urdu, University of Sargodha

Abstract

Iqbal Studies usually have three trends in Urdu, pro-Iqbal, anti-Iqbal and disinterested critical approach towards his poetry and message. This article analyses the work of Saeed Ahmad Rafique, Iqbalist who belongs to the third trend. Saeed Ahmad's core subjects were Philosophy and Aesthetics, which helped him shedding lights on Iqbal from diffrent angle. This analysis is based on his book *Iqbal ka Nazria-e Akhlaq*.

Keywords:

اُردو شعر، تنقید، عرب ملوکیت، اشتراکیت، مسلم امہ، علامہ اقبال، عبدالسلام ندوی، اختر حسین رائے پوری

اُردو شعر و ادب پر نظر ڈالی جائے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ جس شاعر پر سب سے زیادہ تحقیقی وتنقیدی کام ہوا وہ علامہ اقبال ہیں۔ غالب کو اپنے دور کے لوگوں اور ناقدین سے یہ شکوہ تھا کہ انھوں نے ان کی عظمت و حکمت کو نہ پہچانا اور اس کا بروقت اعتراف نہ کر سکے لیکن اقبال اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان کی زندگی میں ہی ان کی شاعری پر تحقیقی وتنقیدی نوعیت کا کام ہوا۔ ادیبوں نے اقبال کی زندگی میں ان کے بڑے پن کا اعتراف کیا اور بعض نے ان کے قول و فعل اور شاعری پر اعتراضات بھی کیے جو ایک لحاظ سے ان کی مقبولیت کا ثبوت ہیں۔ اقبال کی وفات کے بعد تو گویا ''دبستانِ اقبال'' کھل گیا، جسے اقبالیات کا نام دیا گیا۔ بلاشبہ اقبال اس کے مستحق بھی ہیں، ان کی شخصیت، شاعری اور فکر نے بیسویں صدی کے ہندوستانیوں پر بالعموم اور ہندوستانی مسلمانوں پر بالخصوص سب سے زیادہ اثرات ڈالے ہیں۔

اقبال پر اردو تنقید میں سب سے زیادہ لکھا گیا ہے لیکن یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ تنقیدی مواد کا بیشتر حصہ یا تو عقیدت میں لپٹا ہوا ہے یا پھر اُس میں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے اور یہی مطالعۂ اقبال کی ایک بدقسمتی ہے۔ اقبالیات عموماً تین رجحانات پر مشتمل ہے۔ پہلی رَو میں وہ لوگ آتے ہیں جنھوں نے اقبال پر بہت سے تنقیدی و تحقیقی مقالات لکھے ہیں لیکن انھیں اقبال کے فن و شخصیت میں کہیں پر کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ وہ اقبال کو پیغمبر کا درجہ دینے سے گریز نہیں کرتے اور اقبال کی شخصیت شاعری اور فکر میں کسی قسم کی خامی کی نشان دہی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں نے اقبال کے ساتھ مصنوعی عقیدت کا رشتہ پالا ہوا ہے لیکن اس عقیدت کی وجہ سے وہ اقبال کے پیغام کی روح سے نا صرف دور ہوئے ہیں بل کہ عام قاری کو بھی اصل پیغام سے دور کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں کی وجہ سے اقبال کے فکر و فن کو نقصان پہنچا ہے۔ ناقد کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ فن اور فن کار کے ہر پہلو کو دیکھے اور اس کے بعد کوئی فیصلہ صادر فرمائے لیکن ناقدین میں سے بیشتر اقبال کے صرف ایک ہی پہلو پر زور دیتے ہیں:

''علامہ اقبال یورپ کو شیطان کی کارگاہ اسی لیے کہتے ہیں کہ یورپ نے مادہ پرستی کے نظریات کو فروغ دے کر اور چھینا جھپٹی کو تہذیب و تمدن کی علامت بنا کر

پورے عالم انسانیت کو بنیادی قدروں سے محروم کر دینے میں بڑا پُر زور کردار ادا کیا ہے۔"(۱)

اب یہ بات درست ہے کہ اقبال کو مغربی دنیا اور اس کی تہذیب وتمدن ورنگا رنگی میں بہت سی خامیاں اور کمزوریاں نظر آتی ہیں اور وہ ان کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اقبال مغرب کی تہذیب و ثقافت میں بہت سی خوبیاں بھی پاتے ہیں اور ان کی طرف پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ ہم صرف ایک ہی پہلو پر بات کرتے ہیں۔ کیا اس میں ہماری مغرب دشمنی شامل ہے یا پھر ہم کسی احساس کم تری کا شکار ہیں۔ پروفیسر محمد منور، اقبال کے ان ناقدین میں سے ہیں جنھوں نے اقبال پر کثرت کے ساتھ لکھا ہے، انھوں نے اقبال کی تمام فکر کو قرآن وحدیث سے جوڑا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال ان دو ماخذ کے علاوہ کسی اور چیز یا فکر سے متاثر نہیں ہوتے۔

اسی طرح پروفیسر عبدالمغنی، اقبال شناسوں میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن ان کی کتاب ''اقبال اور عالمی ادب'' کا مطالعہ کیا جائے تو احساس ہوگا کہ انھوں نے پوری کتاب میں اقبال کو دوسرے عالمی مشاہیر کے ساتھ بٹھانے کی کوشش کی ہے اور ایسا صرف کلیم الدین احمد کے جواب میں کیا گیا ہے۔ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبال کی فکر تک پہنچا جائے اور نا صرف اس تک پہنچا جائے بل کہ اسے عام آدمی تک پہنچایا جائے تا کہ فکرِ اقبال سے استفادہ کیا جا سکے۔ اگر ہم نے کلامِ اقبال کو بھی قرآن مجید کی طرح صرف خیر و برکت کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تو یہ بھی قرآن مجید کی طرح طاقوں میں رکھے جانے اور چومنے اور تعویز لکھنے کے کام آئے گا۔

اقبال کی تنقید میں دوسری رو اُن ناقدین کی ہے جو اقبال پر مختلف اعتراضات کرتے ہیں۔ ان اعتراضات کی نوعیت چار قسم کی ہے: i۔ ادبی، لسانی، فنی اعتراضات، ii۔ فلسفہ و فکر پر اعتراضات، iii۔ سیاسی وطنیت کے خیالات پر اعتراضات، iv۔ مذہبی تعصب کی بنا پر اعتراضات۔ آل احمد سرور، اقبال پر کیے جانے والے اعتراضات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اب اس نسل نے دیکھا تو اقبال کے کلام میں کئی خرابیاں نظر آئیں۔ایک نے کہا اقبال کا کلام محدود اور مقامی ہے۔دوسرے نے اعلان کیا کہ چونکہ اقبال کی زندگی اور شاعری میں تضاد ملتا ہے اس لیے ان کی شاعری قابل اعتناء نہیں ہے... اقبال ایسے ماضی کی یاد میں محو ہے جو کبھی واپس نہیں آ سکتا۔چوتھے کو اقبال کے کلام میں مزدوروں اور جمہوریت کے خلاف وعظ نظر آیا... صلح پسند حضرات اُن سے اس وجہ سے ناراض ہوئے کہ وہ قتل وخون کی دعوت دیتے ہیں اور چنگیز اور تیمور کو دوست رکھتے ہیں... مولویوں کو یہ گوارا نہ ہوا کہ اُن کے بجائے ایک 'خراباتی'' دین کی حمایت کا جھنڈا بلند کرے۔''(۲)

علامہ اقبال پر جن لوگوں نے اعتراضات کیے ہیں ان میں سے زیادہ تر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادبا و ناقدین ہیں، جن میں اختر حسین رائے پوری، علی سردار جعفری، عزیز احمد، احمد ندیم قاسمی زیادہ اہم ہیں۔لیکن ان کے علاوہ بھی بعض ناقدین اقبال کے فکروفن پر بعض تحفظات رکھتے ہیں جن میں سیماب اکبرآبادی، مولوی عبدالسلام ندوی، عبدالمالک آروی، ڈاکٹر سچدانند سنہا اور کلیم الدین احمد نمایاں ہیں۔اقبال پر زبان کے حوالے سے جو اعتراضات کیے گئے وہ زیادہ تر اُن لوگوں کی طرف سے تھے جو لسانی تعصب کا شکار تھے اور اہل زبان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔اقبال کی فکر پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان میں سب سے پہلا بڑا اعتراض ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے کیا:

''اقبال ایک قوم کو ہی نہیں بلکہ اُس قوم کے ایک خاص طبقے کو مخاطب کرتا ہے۔ یہ طبقہ نوجوانوں کا ہے۔تاریخ اسلام کا ماضی اسے بہت روشن اور شاندار معلوم ہوتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا دورِ فتوحات اسلام کے عروج کی دلیل ہے اور ان کا زوال یہ بتلاتا ہے کہ مسلمان اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں۔حالاں کہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اسلام کی ابتدائی فتوحات عرب ملوکیت کی فتوحات نہیں تھیں اور تاریخ کے کسی دور میں کبھی اسلامی تصورِ زندگی پر عمل بھی ہوا تھا۔''(۳)

اس کے علاوہ اختر حسین رائے پوری کو یہ بھی اعتراض ہے کہ اقبال ملوکیت اور سرمایہ داری کا دشمن تو ہے لیکن صرف اس حد تک کہ جس حد تک ایک متوسط طبقے کا شخص ہوسکتا ہے یعنی وہ صرف بندہ اور بندہ نواز کی تفریق ختم کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح اقبال مزدوروں کی حکومت کو بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ اقبال کو فاشسٹ قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح کے اعتراضات علی سردار جعفری کو بھی ہیں:

> ''اقبال نے اپنے شاہین کو تیمور، ابدالی، نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا تھا اور ان کے نزدیک پوری انسانی تاریخ ایسے ہی خودی سے سرشار افراد کے اشاروں پر چلتی ہے اور فوق البشر کی تلاش میں ہے۔ یہ انفرادیت پرستی اور ہیرو پرستی خالص بورژوا تصور ہے جو اپنی آخری شکل میں فاشٹ کا روپ دھار لیتی ہے۔ (۴)

حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسند ناقدین اقبال کے بارے میں صرف تعصب کی بنا پر یہ باتیں کہہ گئے ہیں۔ ان میں سے بعض ناقدین نے تو بعد میں اپنے اس تعصب کا اعتراف بھی کرلیا تھا۔ مطالعہ اقبال کی یہی بدقسمتی ہے کہ ایک طرف تو انھیں مذہبی پیغامبر بنا دیا گیا اور دوسری طرف انھیں صرف مسلمانوں کا نمائندہ یا ایک مذہبی اور متعصب شخص سمجھا گیا۔ اقبال نہ تعصب کا شکار ہیں نہ ہی وہ جمہوریت اور اشتراکیت کے مخالف ہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ وہ ان تمام فلسفوں اور نظریات کے متعلق بعض تحفظات رکھتے تھے جن پر انھوں نے اپنی شاعری اور خطبات میں کھل کر اظہار کیا ہے۔

اب ہم اقبال کے اُن ناقدین کا جائزہ لیتے ہیں جنھوں نے اقبال کے فکر و فن کا حقیقی انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ ان لوگوں میں آل احمد سرور، پروفیسر عثمان، عابد علی عابد، خلیفہ عبدالحکیم اور سعید احمد رفیق قابل ذکر ہیں۔

اقبال پر جن ناقدین نے غیر جانبدارانہ انداز میں تجزیہ و تنقید کی کوشش کی ہے انھیں ناقدین میں ایک نام سعید احمد رفیق کا بھی ہے۔ سعید احمد رفیق ایک کثیر الجہت لکھاری ہیں۔ فلسفہ، جمالیات، اخلاقیات، تنقید ادب، تاریخ انسانی اُن کے خاص موضوعات ہیں لیکن فکر اقبال پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کا تحقیقی و تنقیدی مقالہ اقبالیات کی روایت میں اہم مقام رکھتا ہے۔ اس مقالہ کی انفرادیت یہ بھی ہے

کہ اس میں فکرِ اقبال کی تفہیم کے لیے خالصتاً فلسفیانہ طریقہ کار استعمال کیا گیا ہے۔ سعید احمد رفیق چوں کہ فلسفیانہ فکر اور مزاج کے نقاد ہیں اس لیے انھوں نے اقبال کی شخصیت اور شاعری کو اسی تناظر میں دیکھا ہے۔ ان کی کتاب اقبال کا نظریہ اخلاق پہلی بار نومبر ۱۹۶۰ء ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس سے قبل یہ مقالہ ماہنامہ ''اقبال'' لاہور، اپریل ۱۹۵۷ء (جلد ۵، شمارہ ۶) میں شائع ہو چکا تھا۔ کتابی صورت میں اس مقالے میں کئی اضافے کیے گئے ہیں۔

یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جس میں مصنف نے اقبال کے نظام اخلاق کے متعلق اپنی تنقید و جستجو پیش کی ہے۔ مصنف کے مطابق اقبال کے نظام اخلاق میں مرکزی حیثیت خودی کو حاصل ہے جسے انھوں نے ''ام الفضائل'' کا نام دیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اقبال کے نظامِ اخلاق کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے بل کہ اقبال کے نظام اخلاق کی بنیادوں کی تلاش کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اقبال کے نظام اخلاق کا اس کے ہم عصر پیش رو مشرقی اور مغربی مفکرین کے نظامِ اخلاق کے ساتھ تقابل کیا ہے اور ہر دو طرح کے نظام اخلاق کی کم زوریوں اور خصوصیات کو سامنے لائے ہیں۔

اس کتاب کا پہلا باب اقبال کی پیدائش، اس وقت کے حالات، مسلم امہ کی بالخصوص اور دنیا کی صورتحال بالعموم، اقبال کی شخصیت ان کی فکر میں ارتقا اور اس وقت کی موثر تحریکوں کے مختصر احوال پر مبنی ہے۔ اس کتاب کے آئندہ چھ ابواب اقبال کے نظام اخلاق کے مرکزی نکتہ خودی اور اس کو کم زور کرنے اور تقویت پہنچانے والے (ایجابی و سلبی) عناصر کے جائزے پر مشتمل ہیں۔ آخری باب میں مصنف نے اقبال کے مابعد الطبیعاتی نظریات پر بحث کی ہے۔

اقبال بلند پایہ شاعر کے مرتبہ پر فائز ہونے کے ساتھ ایک فلسفی اور مفکر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اردو ناقدین کی کثیر تعداد آج تک اس بات پر اختلاف کا شکار ہے کہ اقبال فلسفی تھا یا شاعر۔ سعید احمد رفیق کی تحریر کا کمال ہے کہ وہ کسی بھی پہلو پر جب بات کرتے ہیں تو دلیل کے ساتھ۔ اقبال کے فلسفی اور شاعر ہونے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ اقبال ایک زبردست شاعر ہونے کے باوجود صرف شاعر نہ

تھے بلکہ برنگ اعجاز شاعرانہ ایک پیغامبر، ایک مفکر اور ایک کلیم بھی۔ ان کی شاعرانہ عظمت سے انکار ممکن نہیں لیکن شاعری اُن کا اصل مقصد نہ تھا بلکہ کسی اعلیٰ تر مقصد کو حاصل کرنے کا صرف ایک ذریعہ۔ انہوں نے بعض خاص مقاصد کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات اور روایات کی رو سے نظم کا طریقہ اختیار کیا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ شعر دل و دماغ پر جس طرح اثر انداز ہوتا ہے، نثر کا ایک جملہ اس محروم ہے۔"(۵)

مصنف نے جس زوایۂ فکر سے اقبال کی شاعری و فکر پر تنقید کی ہے، تفہیم اقبال کے لیے اس زاویۂ نگاہ کی اشد ضرورت ہے۔ اقبال کی شاعری اور فکر کو سمجھنے کے لیے کسی ایسے ناقد کی ضرورت تھی جو خود فلسفیانہ مزاج کا حامل ہو اور اقبال کے نظامِ اخلاق اور فکر کو تجزیاتی انداز میں دیکھے۔ اقبال کی فکر کے ماخذات اور اس کے مقاصد کو بھی سامنے رکھے۔ سعید احمد رفیق میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

اقبال کی شاعری اور فکر میں جس طرح سے ارتقا ہوا ہے شاید ہی کسی بڑے مفکر یا شاعر کے ہاں ایسا ہو۔ بعض اوقات تو ارتقا کی بجائے تضاد کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ اس تضاد اور ارتقا کا پس منظر اور وجوہات کی تلاش آسان کام نہیں ہے لیکن اس کام کو سعید احمد رفیق نے بخوبی سرانجام دیا ہے۔

سعید احمد رفیق نے اس کتاب میں جس طرح اقبال کی شخصیت، شاعری اور فلسفے کی پرتیں کھولیں ہیں، اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نہایت زیرک نقاد ہے۔ کسی بھی ادبی فن پارے پر تنقید کے لیے ضروری ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں پر وسعت نظر کے ساتھ بحث کی جائے اور اس فن پارے کے جزوی نسبتاً کم اہم نکات اور ابتدائی باتوں پر بھی اسی طرح توجہ دی جائے جس طرح اس فن پارے میں شامل بڑے موضوعات پر دی جاتی ہے۔ مصنف نے یہی رویہ اپنی اس کتاب میں اپنایا ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال کچھ یوں ہے کہ عام طور پر اقبال کے بارے میں مختلف ناقدین جب بحث کرتے ہیں تو اس کے بنیادی موضوعات مثلاً، عقل و عشق، جمہوریت اور اشتراکیت وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے براہِ راست ان موضوعات پر آ جاتے ہیں۔ حالاں کہ بہتر یہ ہے کہ ان موضوعات کی

تعریف، مفہوم، پس منظر واضح کیا جائے۔سعید احمد رفیق نے یہی طریقہ اپنایا ہے۔ایک جگہ جب وہ خودی پر بحث کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے خودی کے مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

''ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کے ہاں یہ لفظ بہ معنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اُردو میں مستعمل ہے۔اس کا مفہوم محض احساس نفس یا تعین ذات ہے۔اس لفظ کا مطلب تکبر نہیں بلکہ اس سے مراد ہے اپنی ذات کی معرفت، معرفت نفس، خودشناسی، عرفان نفس... یہ وہ منزل ہے جس پر پہنچنے کے بعد انسان خلیفۃ اللہ فی الارض، مرد مومن، انسان کامل، درویش، مرد حر، قلندر، صاحب فقر ہو جاتا ہے۔''(۲)

اس سادہ اسلوب میں خودی کی جو تعریف کی گئی ہے وہ عام قاری بھی سمجھ سکتا ہے جب کہ عمومی طور پر ہمارے ناقدین اتنے فلسفیانہ انداز میں ان تصورات کے مفہوم واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ مزید مشکل ہو جاتے ہیں۔اقبال ہمارے ہاں جو مشکل شاعر اور فلسفی سمجھا جاتا ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔ایک ہماری قوم کی کم علمی کہ ہم ادب، فلسفہ، مذہب اور تاریخ جیسے علوم میں بے بہرہ ہے۔دوسرا وہ مشکل پسند ناقدین و شارحین جنھوں نے اپنی تحریروں اور شرحوں کے ذریعے اقبال کو کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔سعید احمد رفیق کا کمال یہی ہے کہ انھوں نے اقبال کے جس بھی موضوع پر بات کی ہے، اس کو اتنے سادہ اور دل چسپ اسلوب میں بیان کیا ہے کہ عام سطح کا قاری بھی اقبال کے افکار و خیالات کو جان سکتا ہے:

اس امر پر تقریباً اقبال کے تمام ناقدین متفق ہیں کہ اقبال کی فکر و شاعری کا بنیادی مرکز خودی ہے۔اسی موضوع کے اردگرد اقبال کے دوسرے نظریات گردش کرتے نظر آتے ہیں۔سعید احمد رفیق نے بھی بنیادی طور پر اسی مرکزی موضوع خودی کو اپنا موضوع بحث بنایا ہے اور پھر اسی خودی کو تقویت پہنچانے والی قدریں (ایجابی) اور کمزور کرنے والی اقدار (سلبی) پر بحث کی ہے۔

''اقبال کے لحاظ سے اقدار کی چار قسمیں ہیں: ۱۔انفرادی ایجابی، ۲۔انفرادی سلبی،

۳۔اجتماعی ایجابی،۴۔اجتماعی سلبی ۔اقبال کی پیش کردہ ان تمام اقدار کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد ہی اقبال کا نظریہ اخلاق پوری طرح واضح ہوسکتا ہے۔"(۷)

اقبال کے نظریہ عقل وعشق پر بحث کرتے ہوئے ناقدین یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اقبال عشق وجدان کے حامی اور عقل کے مخالف ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ اقبال عقل وعشق پر بہت زیادہ بحث کرتے ہیں لیکن شاید ہی ان کی تمام شاعری میں کہیں عقل کو منفی قدر کے طور پر لیا گیا ہو لیکن ہمارے ناقدین اسے اقبال کے ہاں منفی قدر کے طور پر لیتے ہیں اور عشق کا الٹ سمجھتے ہیں۔سعید احمد رفیق نے اسی حوالے سے مدلل بحث کی ہے۔مصنف کے نزدیک عقل کوئی ایسی شے نہیں ہے کہ جس سے اقبال نے گریز کرنے کو کہا ہو بلکہ وہ عقل کو منزل پر پہنچنے کی پہلی سیڑھی سمجھتے ہیں ۔البتہ اتنا ضروری ہے کہ عشق کے بغیر عقل کی مدد سے منزل کا حصول ممکن نہیں:

عقل کو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

"بہر حال یہ ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اقبال کے نزدیک "انا" خودی کے استحکام کے لیے عقل اور علم نہایت ضروری اقدار ہیں۔جن کے بغیر انفرادیت کی تکمیل اور خودی کی بلندی ممکن نہیں۔علاوہ ازیں اقبال عقل اور عشق کو دو متضاد صفات نہیں مانتے۔"(۸)

مصنف نے اقبال کے فقر کے بارے میں تصور کو بھی سادگی سے واضح کیا ہے۔فقر ایسا لفظ یا اصطلاح ہے کہ جس کے بارے میں ناقدین کے ساتھ قارئین عمومی طور پر تضاد کا شکار رہتے ہیں اور اقبال کے ہاں جن معنوں میں فقر کو استعمال کیا گیا ہے اس بارے میں بھی عام طور پر متضاد آرا ملتی ہیں۔سعید احمد نے اس بات کو شروع میں ہی واضح کر دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"فقر کو عام طور پر بے کسی، مسکینی، مجبوری اور رہبانیت کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔لیکن اقبال فقر و استغنا سے وہ بے نیازی مراد لیتے ہیں جسے مادی وسائل کی موجودگی اور غیر موجودگی کا خیال تک نہ ہو۔"(۹)

یہاں پر موجودگی اور غیر موجودگی کے خیال تک نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ انسان ان کے بارے میں فکرمند نہ ہو اور نہ ہی اپنی ساری توانائیاں ان کے لیے وقف کر دے۔

مزید برآں، مصنف نے اقبال کے نزدیک بے تعلقی کا جو مفہوم بنتا ہے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ بے تعلقی سے مراد بے نیازی ہے۔یہ ایسی قدر ہے جو انسان میں عمل کی قوت کو دوچند کر دیتی ہے۔مصنف نے جن اقدار کو اقبال کے ہاں سب سے زیادہ اہم پایا ہے اُن میں عشق،عمل یقین، بلند ہمت، تیز نگاہی اور رواداری ہیں۔ بالا سطور میں اُن اقدار پر مختصر انداز میں بات کی گئی ہے جو ایجابی اقدار ہیں اور انفرادی اور اجتماعی خودی کی تقویت کے لیے ضروری ہیں۔اب چند اُن اقدار پر بات کریں گے کہ جن کو اقبال نے سلبی اقدار ٹھہرایا ہے اور یہ وہ اقدار ہیں جو خودی کی تکمیل میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ان میں سے چند اہم اقدار عجمی تصوف، ملائیت، وطنیت، ملوکیت، جمہوریت ، آمریت، اشتراکیت شامل ہیں۔

اقبال پر تنقید کرنے والے حضرات نے ان اقدار پر جب بھی بحث کی ہے تو ان اقدار کے مفہوم، پس منظر اور ان اقدار کے حوالے سے بحث کرنے والے دوسرے مشرقی و مغربی مفکرین کا ذکر بھی کیا ہے۔بعض ناقدین نے اس بات کو بھی موضوع بحث بنایا ہے کہ اقبال نے ان اقدار کی بنیادی بحث مغربی فکرین سے اخذ کی ہے۔اس کے علاوہ ان پہلوؤں پر بھی بحث ملتی ہے کہ اقبال نے ان اقدار کے بارے میں جو نظریات پیش کیے ہیں اُن میں بعض اوقات تضاد کی کیفیت ملتی ہے۔ سعید احمد رفیق نے بھی ان تمام موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے اور منفرد نتائج اخذ کیے ہیں جو اقبال کے قارئین کے لیے دل چسپ بھی ہیں اور کسی قدر رنئے بھی۔علامہ اقبال نے خودی کی راہ میں رکاوٹ بننے والی جن اقدار کا ذکر کیا ہے اُن میں سب سے اہم عجمی تصوف ہے۔تصوف کے بارے میں

مسلمانوں میں ہمیشہ سے مختلف نظریات رہے ہیں۔عام طور پر تصوف کے بارے میں دو طرح کے نظریات ملتے ہیں۔ایک یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات میں اپنی ذات کو ضم کرنا جس کو عام طور پر فنا فی اللہ کہا جاتا ہے۔اقبال کے نزدیک یہ تصوف کی اصل حالت نہیں ہے بل کہ اقبال اسی کو عجمی تصوف کا نام دے کر رد کرتے ہیں۔اقبال کے انھیں نظریات کو مدلل انداز میں سعید احمد رفیق نے موضوع بحث بنایا ہے اور خاصی طویل بحث کے بعد قارئین کے لیے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال کس طرح کے تصوف کے قائل ہیں۔وہ اس بارے میں اقبال کا ایک قول نقل کرتے ہیں:

> ''حقیقی اسلامی بے خودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات، رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے اس طرح یہ کہ اس پابندی کے نتائج سے انسان بالکل لاپرواہ ہو جائے اور محض رضا اور تسلیم کو اپنا شعار بنائے۔یہی اسلامی تصوف کے نزدیک فنا ہے البتہ عجمی تصوف فنا کے کچھ اور معنی جانتا ہے۔''(۱۰)

یہ تو علامہ اقبال کا اپنا بیان ہے لیکن فاضل نقاد نے اس بیان پر اکتفا نہیں کیا بل کہ تصوف کے حوالے سے اقبال جن شخصیات سے متاثر نظر آتے ہیں اُن کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا ہے۔اقبال نے جہاں بھی ان شخصیات کے بارے میں اپنی رائے دی ہے، اس کو نقل کیا ہے اور ساتھ ہی اقبال کے اپنے پیش کردہ نظریات سے ان کا تقابل کیا ہے۔یہ تو سب جانتے ہیں کہ اقبال مولانا رومی سے کس قدر متاثر ہیں بل کہ اکثر نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ اقبال کی مثنوی ''اسرار خودی'' مولانا رومی کی مثنوی سے متاثر ہے۔اس بارے میں بھی سعید احمد رفیق نے کھل کر بحث کی ہے اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ مولانا رومی اور اقبال دونوں کے خیالات اور نظریات قرآن سے ماخوذ ہیں۔اقبال نے بھی اسی آستانہ سے فیض حاصل کیا جس سے رومی نے۔اس لیے اقبال اور رومی میں مماثلت ناگزیر ہے۔''(۱۱)

سعید احمد رفیق نے نہ صرف عجمی تصوف پر اقبال کے اعتراضات پر بحث کی ہے بل کہ تفصیل

کے ساتھ اُن اعتراضات کا تجزیہ کیا ہے جو اقبال کے بقول اصل اسلامی تصوف میں در آئے تھے اور جن کی وجہ سے اقبال اسے عجمی تصوف کہتے تھے۔

اب ہم سلبی اقدار میں چند اُن اقدار کا تذکرہ کریں گے کہ جن کا پس منظر مغرب ہے اور اس حوالے سے اس بات کا بھی تذکرہ کریں گے کہ اقبال پر مغربی مفکرین اور فلسفیوں سے اخذ و قبول کی جو بحث ہمارے ناقدین میں چلتی رہتی ہے اس بارے میں سعید احمد رفیق کی رائے کس حد تک مختلف ہے۔ سعید احمد نے اقبال کے اخلاقی ڈھانچے اور اساس کی دریافت کی ہے۔ وہ ہمیں اس بات کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اقبال کے فلسفہ اور شاعری کی بنیاد کس چیز پر ہے۔ علاوہ ازیں وہ اقبال کے نظامِ اخلاق کا موازنہ ان مغربی مفکرین سے کرتے ہیں جنھوں نے اس دور میں فلسفہ اور اخلاقیات کے مروجہ نظام کی جگہ نیا نظام لانے کی بات کی۔ اس سلسلے میں ہیگل، نطشے، کانٹ، روسو وغیرہ زیادہ اہم ہیں۔ وہ ان تمام مغربی مفکرین کے نظامِ اخلاق کو تفصیل سے موضوع بحث بناتے ہیں اور اقبال اور ان مغربی مفکرین کے درمیان مشترکہ قدروں کو بھی موضوع بحث بناتے ہیں۔ ہیگل کا تصورِ اخلاق جس میں قانونِ حق، اخلاق معروضی اور معاشرتی اخلاقیات (خاندان، معاشرہ اور اخلاقیات) اقبال کے اس تصورِ ریاست سے اس لیے کم تر محسوس ہوتا ہے کہ اقبال فردِ واحد کی آزادی کو بہت اہمیت دیتا ہے، جب کہ ہیگل کے اس نظامِ اخلاق کے پس منظر میں اس دور کے سیاسی اور معاشرتی منظر نامے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اقبال اپنے ابتدائی فکری عہد میں جماعت کو فرد پر فوقیت دیتے نظر آتے ہیں۔ اس کے لیے مصنف نے اقبال کے لیکچر، ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کا حوالہ دیا ہے اور ساتھ اقبال کی مختلف نظموں کا حوالہ بھی دیا ہے، جن میں سے سب سے اہم ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' ہے لیکن اس بارے میں جو مصنف کا نتیجہ ہے وہ بھی قابلِ غور ہے وہ ان سطور پر اس بحث کا اختتام کرتے ہیں:

> ''بہر حال یہاں ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اقبال اس نظریے کی انتہا پسند صورت کے کبھی قائل نہ تھے۔ اس دورِ اول میں بھی اقبال کے ہاں فرد اور اس کی شخصیت ملتی ہے وہ اس کی ہستی کو مانتے ہیں۔ چاہے وہ اسے موجِ دریا سمجھتے ہوں یا شاخِ شجر۔'' (۱۲)

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

بالاسلسلے کی ایک اور کڑی اقبال اور نطشے کا موازنہ ہے۔اس سلسلے میں مصنف نے تقلیدی اور روایتی راہ سے گریز کرتے ہوئے اقبال اور نطشے کے سماجی اور سیاسی محرکات کا تجزیہ کیا ہے۔نطشے خدا کا منکر تھا اور قوم پرست تھا۔طاقت کی خواہش نطشے کا اصل مقصد ہے۔جب کہ اقبال کے ہاں طاقت اس وقت تک ایک منفی جذبہ ہے جب تک اس طاقت کے ساتھ احساس ہم دردی نہ ہو۔اس حوالے سے سعید احمد رفیق نے اس بحث کو ان سطور پر ختم کیا ہے:

''نطشے صرف جلالی خصوصیات کا مداح ہے۔مثلاً قوت، شجاعت، بہادری، کوشش، ہمت اور جمالی خصوصیات مثلاً ہمدردی اخوت مساوات رحم کا زبردست مخالف ہے۔اقبال تکمیل نفس کے لیے ہر دو طرح کی خصوصیات کو لازمی اور ضروری سمجھتے ہیں۔''(۱۳)

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اب قدرے ان سلبی اقدار کا ذکر بھی ہو جائے جن پر علامہ اقبال نے اپنی شاعری و فلسفہ میں بہت زیادہ زور دیا ہے اور سعید احمد رفیق نے ان اقدار اور اقبال کے نظریات کو بڑے واضح انداز میں موضوع بحث بنایا ہے۔اس سلسلے میں اشتراکیت اہم قدر رہے۔اس حوالے سے مصنف نے اقبال کا ایک قول نقل کیا ہے:

''زندگی کے دو مختلف نظاموں کا مقابلہ صرف من حیث الکل کیا جا سکتا ہے۔ صرف چند اصولوں مشابہت کی بناء پر انہیں ایک سمجھ لینا نہ ممکن ہے نہ صحیح۔اس

میں تو کوئی شک نہیں کہ جہاں تک اسلام کے معاشی نظام کا تعلق ہے وہ اشتراکیت کے بہت قریب ہے۔"(۱۴)

سعید احمد رفیق نے اس بات پر خاصی بحث کی ہے کہ اقبال اشتراکیت کے بہت سے پہلوؤں کو پسند کرتے ہیں۔اس کے ثبوت کے طور پر مصنف نے اقبال کی شاعری سے بہت سی مثالیں دی ہیں لیکن ساتھ وہ اس بات کو بھی قارئین کے سامنے لاتے ہیں کہ اشتراکیت کو پسند کرنے کے باوجود اقبال کو اس پر بنیادی نوعیت کے اعتراضات تھے۔اس سلسلے میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اقبال کو اشتراکیت پر جو سب سے بڑا اعتراض ہے وہ اس میں ایجابی پہلو کی غیر موجودگی ہے۔ہر تعمیر کے لیے تخریب لازمی اور ضروری ہے لیکن تخریب صرف ایک ذریعہ ہے۔اصل مقصد تو تعمیر ہے۔اقبال کے خیال میں اشتراکیت نے بہت سی برائیوں کو ختم کر دیا ہے لیکن چونکہ اس کی بنیاد صرف لا پر ہے اس لیے اقبال اسے قابل قبول نہیں سمجھتے۔وہ لا کے بعد الا کو لانا ضروری سمجھتے ہیں۔"(۱۵)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مصنف کس قدر باریکی کے ساتھ ہر پہلو پر نظر رکھے ہوئے ہے۔غرض کہنے کو تو مصنف نے اس کتاب میں خودی کو موضوع بحث بنایا ہے لیکن اس خودی کو تقویت دینے والے اور کم زور کرنے والی اقدار اور ان اقدار کے پس منظر اور ان اقدار کے نمائندوں کا جس وسعت اور جامعیت کے ساتھ تجزیہ کیا ہے وہ مصنف کا ہی خاصہ ہے۔

سعید احمد رفیق نے اپنی اس کتاب کے آخری باب میں اقبال کے مابعد الطبیعیاتی نظریات کا مختصر مگر جامع تجزیہ کیا ہے۔یہاں بھی مصنف نے ان مابعد الطبیعیات نظریاتی کے متعلق مغربی مفکرین کے نظریات کا تجزیہ کیا ہے۔مصنف نے اقبال کے جن مابعد الطبیعیاتی نظریات پر بحث کی ہے ان میں توحید، رسالت، آزادی ارادہ، حیات بعد الممات شامل ہیں۔یہاں پر مصنف نے اقبال اور کانٹ کے ان نظریات پر ایک تقابلی بحث کی ہے اور یہ نتائج اخذ کرتے ہیں کہ کانٹ بنیادی طور پر خدا (وجود باری تعالیٰ) حیات بعد الموت اور آزادی ارادہ کو مفروضات تصور کرتا ہے جب کہ اقبال

کے نزدیک یہ چیزیں ایمان کا حصہ ہیں اور زندگی کا کوئی بھی پہلو اس سے آزاد نہیں ہے اور زندگی کے کسی بھی شعبہ میں یقین کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ان مابعدالطبیعیاتی نظریات میں ایک اہم نظریہ آزادی ارادہ کا ہے۔یہ وہ موضوع ہے جس پر بہت سے مغربی مفکرین نے بحث کی ہے۔سعید احمد رفیق نے نہ صرف ان مغربی مفکرین کے نظریات کو پیش کیا ہے بل کہ ان میں پائی جانے والی کم زوریوں کی بھی نشان دہی کی ہے اور آخر میں اقبال کے نظریات کو بھی واضح کیا ہے۔وہ اس سلسلے میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

> ''علامہ اقبال کا نظریہ بھی فلسفہ اور سائنس کے اس ترقی کن اقدام سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔انہوں نے انسان کو بار بار اس امر کا یقین دلایا ہے کہ وہ طبعی حالات کا محکوم نہیں ہے بلکہ طبعی حالات اس کے محکوم ہیں۔''(۱۶)

مصنف نے ایک اور نکتہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ تمام مغربی مفکرین انسان کے آزادی آرا اور زندگی کے بااختیار ہونے کی بات تو کرتے ہیں لیکن اس سلسلے میں کوئی ثبوت پیش نہیں کرتے جب کہ اقبال اس بارے میں نسبتاً مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ان کے نزدیک زندگی بااختیار نہیں ہے۔انسان کو نامناسب ماحول کے خلاف کش مکش کرنا پڑتی ہے۔ذہنی زندگی طبعی زندگی پر اپنی قوت سے حاوی ہوتی ہے اور ایک دن اسی قوت اور عمل سے ذہنی زندگی طبعی زندگی پر مکمل حاوی ہو جائے گی۔اقبال اور مغربی مفکرین کے درمیان وہ اس فرق کو بھی سامنے لاتے ہیں کہ اقبال مغربی مفکرین کے مقابلے میں انسان کے آزاد اور بااختیار ہونے کا بالواسطہ ثبوت دیتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

> ''چونکہ انسان جدوجہد اور کش مکش کر سکتا ہے۔غیر خود کو اپنا مطیع اور فرماں بردار بنا سکتا ہے۔ماحول کی گرفت سے آزاد ہو سکتا ہے۔اس لیے وہ بالقوۃ آزاد اور بااختیار ہے۔''(۱۷)

اس کے بعد مصنف نے اقبال کے نظریہ بعد الموت کو زیر بحث لانے سے قبل اسلام اور دوسرے مذاہب میں اس تصور کو واضح کیا ہے اور ساتھ ہی مسلم مفکرین کی آرا کا ایک جائزہ بھی لیا ہے۔

آخر میں اقبال کے نظریہ بعد الموت کی وضاحت بھی کی ہے کہ اقبال طبعی طور پر حیات بعد الموت کو ممکن خیال کرتے ہیں۔ آخر میں آزادی ارادہ اور حیات بعد الموت کے اقبال کے نظریات کے متعلق مصنف ان الفاظ پر اپنی بحث کا اختتام کرتے ہیں:

> ”غرض ڈاکٹر اقبال کے خیالات میں آزادی ارادہ اور حیات بعد الموت نہ اخلاقیات کے لیے مفروضات ہیں نہ ہمارے اخلاقی شعور کے بدیہات اور عقل عملی کے مسلمات۔ یہ ہمارے اعمال صالحہ، جدوجہد اور کوشش کا نتیجہ ہیں، انعام ہیں۔ یہ عمل ہے اور صرف عمل ہے جو ایک طرف انسان کو حیات ابدی بخشتا ہے اور دوسری طرف حقیقی آزادی سے نوازتا ہے۔“(۱۸)

ابھی تک ہم نے مصنف کی ان باتوں اور نکات پر غور کیا ہے جو اقبال فہمی کے سلسلے میں منفرد ہیں اور قارئین کے لیے تشفی بخش ہیں۔ یہ تمام مصنف کی خصوصیات ہیں لیکن بعض جگہوں پر مصنف نے اپنی تنقید میں بہت سے تشنہ پہلو بھی چھوڑے ہیں یا بعض معاملات میں مصنف نے شاید اپنی آرا کو زیادہ معتبر جانا ہے اسی سلسلے میں چند مثالیں دیکھتے ہیں۔

ایجابی اقدار میں تصادم پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے اقبال کی ایک تقریر کا حوالہ دیا ہے جس میں اقبال نے یہ پیغام دیا ہے کہ محنتی اور جفاکش ہونا انسان کے لیے بے حد ضروری ہے اور زندگی میں انسان کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں سے متصادم ہونا، انسان کے لیے ضروری ہے۔ اس طرح انسان مزید آگے بڑھتا ہے۔ اب ایک طرف تو اقبال کا یہ پیغام ہے دوسری طرف اقبال کی شخصیت ہے کہ جس کے بارے میں اکثر ناقدین کا خیال ہے کہ اقبال عملی زندگی میں بہت حد تک ناکام اور سست انسان تھے جب کہ فاضل نقاد نے بھی ابتدا میں اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ نفسیاتی تنقید میں مصنف کے قول و فعل میں موجود تضاد کو اہمیت دی جاتی ہے۔ تخلیق کار جس قسم کے احساس کم تری میں مبتلا ہوتا ہے اس کو مثبت انداز میں عام طور پر اپنے فن پاروں میں پیش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ اگر یہاں پر مصنف نفسیاتی تنقید سے کام لیتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔

آخر میں اس کتاب میں مصنف کے اسلوب پر چند باتیں ضروری ہیں۔ ہمارے ہاں تنقید کے مختلف اسلوب رائج ہیں۔ ان میں تشریحی، تاثراتی، تجزیاتی اور تحقیقی انداز زیادہ اہم ہے۔ ان مروجہ اسالیب کے علاوہ ہر شخص کا اپنا ذاتی اسلوب بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سعید احمد رفیق کا اسلوب تجزیاتی اور تحقیقی انداز کا خوب صورت امتزاج نظر آتا ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں ناقدین مشکل اصطلاحات استعمال کر کے آسان بات کو بھی مشکل بنا دیتے ہیں لیکن سعید احمد رفیق میں یہ بھی خوبی ہے کہ انھوں نے فلسفیانہ موضوعات پر نہایت آسان اصطلاحات اور زبان میں اپنی بات قارئین تک پہنچائی ہے۔ علاوہ ازیں اقبال پر تنقید کرتے ہوئے سعید احمد رفیق کے ہاں کوئی بے جا عقیدت یا تعصب نظر نہیں آتا۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

(۱) مرزا محمد منور، ''علامہ اقبال اور تعلیم آدمیت''مشمولہ ایقان اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۸۲ء،ص ۲۰

(۲) آل احمد سرور، ا''قبال کے نکتہ چیں''، مشمولہ عرفانِ اقبال، مرتبہ زہرا معین، لاہور: تخلیق مرکز، ۱۹۸۹ء ص ۶۹۔۶۸

(۳) ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ''ادب اور زندگی''، مشمولہ ادب اور انقلاب، کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۹ء، ص ۵۸۔ اختر حسین رائے پوری نے بعد میں اپنی اس رائے میں ترمیم کی تھی۔ وہ ''گردراہ'' میں لکھتے ہیں: ''اس وقت میں نے اقبال کا کلام جستہ جستہ پڑھا تھا۔ اب انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کی شاعری اور شخصیت کی عظمت کا اقرار کروں۔'' ملاحظہ کیجیے گرد راہ ص ۸۵۔

(۴) اختر حسین رائے پوری، ادب اور زندگی

(۵) سعید احمد رفیق، اقبال کا نظریہ اخلاق، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۶۲ء، ص ۱۹

(۶) ایضاً۔ ص ۴۷ (۷) ایضاً۔ ص ۵۳

(۸) ایضاً۔ص۵۹

(۹) ایضاً۔ص ۶۸

(۱۰) ایضاً۔ص۱۱۳

(۱۱) ایضاً۔ص۴۰

(۱۲) ایضاً۔ص۱۳۹

(۱۳) ایضاً۔ص۳۶

(۱۴) ایضاً۔ص۱۷۶

(۱۵) ایضاً۔ص۱۸۱

(۱۶) ایضاً۔ص۲۰۴

(۱۷) ایضاً۔ص ۲۰۷

(۱۸) ایضاً۔ص۲۱۴۔